© rasailojaraid.com

مسلمانوں کا ذوق کتاب داری

پروفیسر سید محمد سلیم ○

طبعی لحاظ سے عرب ایک بے آب و گیاہ ریگستان تھا۔ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بھی بنجر تھا۔ مگر اسلام کے آنے کے بعد عرب میں علوم و فنون کی فصل بہار لہلہا اٹھی۔ علوم کی ایجاد و اختراع میں عربوں نے کسی ہمسایہ قوم کے سامنے زانوے تلمذ تہ نہیں کیا۔ تمام علوم ان کے طبع زاد ہیں اور خداداد ہیں۔

قرآن مجید کی پہلی وحی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی وہ یہ ہے: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (علق ۱:۹۶) پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔۔۔ اس کے بعد جو وحی نازل ہوئی وہ یہ ہے: نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ (القلم ۱:۶۸) ن۔ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔

مسلمانوں میں پڑھنے لکھنے کی تحریک قرآن مجید کی ان آیات مبارکہ سے ہوئی ہے۔ ان آیات کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر واقع حضرت ارقم بن ابی ارقمؓ صحابی کے گھر میں ایک مخفی مدرسہ جاری فرما دیا تھا۔ یہاں نومسلم صحابہ آتے تھے اور قرآن مجید کی نازل شدہ آیات یاد کرتے تھے۔ یہ اسلام کا پہلا مدرسہ تھا۔

مدینہ ہجرت کرنے کے بعد آزاد فضا میسر آگئی۔ وہاں سب سے پہلے ایک مسجد تعمیر کی۔ اس کے ساتھ ایک صفہ (چبوترا) بھی تعمیر کرایا۔ یہ تھا اسلام کا پہلا باقاعدہ مدرسہ۔ اس طرح مسجد کے ساتھ مدرسہ کا تعلق روایت بن گیا۔ اس کے بعد جہاں جہاں مسلمانوں کے قدم پہنچے اور مساجد تعمیر ہوئیں وہاں مدارس بھی قائم ہو گئے۔ مثلاً بصرہ ۱۴ھ' کوفہ ۱۷ھ' بیت المقدس ۱۷ھ وغیرہ۔

کتب نویسی کی تحریک کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے اس فرمان سے فروغ حاصل ہوا ہے جس میں انھوں نے احادیث رسولؐ جمع کرنے کا حکم دیا تھا۔ صحابہؓ اور تابعینؒ نے بڑی محنت و مشقت سے احادیث

○ سابق ڈائریکٹر' ادارہ تعلیمی تحقیق' لاہور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جمع کیں۔ پھر ان کی تدوین، ترتیب اور تحقیق میں مدتیں بلکہ صدیاں صرف کر دیں۔ زوال بغداد تک مسلمانوں کی نظر میں اعلیٰ اور اشرف علم، علم حدیث تھا۔ مسلمانوں کا یہ بڑا قابل فخر کارنامہ ہے۔

کتب نویسی کو صنعت کاغذ سازی سے غیر معمولی تقویت پہنچی۔ یہ صنعت مسلمانوں نے اموی دور میں چینی قیدیوں سے حاصل کی۔ پھر مسلمانوں نے اس صنعت کو فروغ دیا اور ساری دنیا میں پھیلا دیا۔ اس کے بعد کتب خانوں کا وجود میں آجانا ایک لازمی امر تھا۔ بنی امیہ کی حکومت کے دور میں بڑے بڑے کتب خانے قائم ہو گئے تھے۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے سب سے پہلا کتب خانہ معاویہ بن یزید (۶۴ھ) نے قائم کیا تھا۔ معمر نے بیان کیا ہے کہ خلیفہ ولید ثانی کے عہد میں امام زہری کی کتابیں اونٹوں پر لاد کر لائی گئی تھیں۔ بغداد، دمشق، قاہرہ اور قرطبہ اہل علم کے مراکز تھے۔ بیت الحکمت اور خزانۃ الکتب کے نام سے کتب خانے قائم ہو رہے تھے۔

مساجد میں علما درس دیتے تھے۔ طلبہ ذوق و شوق سے ایک شہر سے دوسرے شہر میں اور ایک استاد سے دوسرے استاد کے درس میں شرکت کرنے کے لیے سفر کرتے رہتے تھے۔ درس و تدریس کے علاوہ علما، تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔ بلاد اسلامیہ کے دیار و امصار میں علمی سرگرمیاں جاری رہتی تھیں۔

کُتّاب اور خطاط تحسین خط میں مشغول رہتے تھے۔ عباسیوں کے مشہور خطاط ابن مقلہ نے شاہی فرمان قیصر روم کو لکھ کر بھیجا تھا۔ فرمان کی رعنائی اور حسن سے قیصر اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اس فرمان کو اپنے خزانے میں محفوظ کر لیا اور خاص موقعوں پر اس کا مظاہرہ کرتا تھا (ابوحیان توحیدی، علم الکتاب، ص ۱۵، ۱۴۱۳ھ، ترجمہ لاہور ۱۹۶۶ء)۔

تزئین و آرائش کتب کا فن مسلمانوں میں بہت ترقی کر گیا تھا۔ روشنائی، جدولیں، نقش و نگار، سونے کے پانی سے تیار کیے جاتے تھے۔ ایسی کتابوں کو مطلّا اور مذہّب کہتے تھے۔ اندلس میں مسلمانوں کی تباہی کے موقع پر صلیبی مسیحیوں نے کتب خانے نذر آتش کیے تو وہاں سونا پگھل رہا تھا۔ اسی طرح بغداد کی تباہی کے موقع پر تاتاریوں نے جب کتب خانے نذر آتش کیے تھے تو اس وقت بھی سونا پگھل رہا تھا۔ بغداد کا واقعہ مورخ کبیر حافظ ابن کثیر نے بیان کیا ہے۔

علوم و فنون کی یہ ساری سرگرمیاں، نقش و نگار کی یہ ساری روایتیں تقریباً سارے عالم اسلام میں فروغ پا رہی تھیں۔ رشک اور رقابت میں ایک علاقے کے علما، دوسرے علاقے کے اہل علم سے مقابلہ کرتے تھے۔ جاحظ نے ایک کتاب لکھی فضل السود علی البیض (کالوں کی فضیلت گوروں پر) جس میں بعض سندھی علما کے کارنامے بیان کیے ہیں۔ ابن حزم اندلسی نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس میں مغاربہ (اندلس اور مراکش) کی علمی سرگرمیوں کا مقابلہ مشارقہ (خراسان، ایران، عراق) کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علما کی سرگرمیوں سے کیا ہے۔

برعظیم پاک و ہند دولت غزنویہ کے عہد میں عالم اسلام کا جزو بنا۔ بہ تدریج یہاں علمی روایات--- مدارس' مساجد' خانقاہیں--- درس و تدریس' تصنیف و تالیف کی بساط جم گئی۔ اسی طرح اس سے قبل خراسان میں یہ روایات قائم ہو چکی تھیں۔ یہاں بھی علم کی اور علما کی قدردانی ہونے لگی۔ اس طرح برعظیم کا خطہ خراسان' ماوراالنہر کے ہم پلہ ہو گیا۔ البتہ یہاں کوئی ابن حزم اندلسی جیسا اہل قلم پیدا نہیں ہوا جو اس خطے کے علما کے محاسن اور کارنامے بیان کرتا اور دوسرے خطوں کے علما سے مقابلہ کرتا۔

دولت غزنویہ کا بانی سلطان محمود غزنوی علم دوست سلطان تھا۔ فقہ حنفی میں اس کی ایک تصنیف ہے۔ اس کے دربار سے چار سو علما و فضلا اور شعرا وابستہ تھے۔ اس کے دربار میں ایک وسیع کتب خانہ تھا (مورخ فرشتہ)۔ پاکستان کے بلوچ اور پٹھان قبائل کو اس نے مسلمان بنایا اور ان میں علم کی اشاعت کی۔ انگریزوں نے سیاسی مصلحتوں کی خاطر اس کو غلط رنگ میں پیش کیا۔ قنوج کی فتح پر راجا رام آریہ نے اس کی شان میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ محمود نے خوش ہو کر ہاتھی انعام میں دیا تھا۔

عربی خط کی ترقی کی عجیب صورت رہی ہے۔ جب کہیں نئی سلطنت یا نئی بادشاہت قائم ہوئی' وہاں کاتبوں اور اہل کاروں نے ایک نیا خط--- جدید طرز نگارش--- رائج کر دیا۔ اس بادشاہت کے دور میں اس خط نے خوب ترقی کی اور خوب مقبول ہوا۔ ہلاکو خان کے برخلاف ایل خانیوں نے بغداد چھوڑ کر تبریز کو دارالخلافہ قرار دیا تو اہل کار اور خطاط وہاں جمع ہو گئے۔ انھوں نے ایک نیا خط "خط تعلیق" ایجاد کیا۔ عثمانیوں نے بروصہ چھوڑ کر قسطنطنیہ کو دارالخلافہ بنایا تو وہاں "خط دیوان" وجود میں آیا۔ تیموریوں نے جب ہرات (افغانستان) کو دارالحکومت قرار دیا تو وہاں "خط نستعلیق" وجود میں آیا۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ یہ خط' بہار' شمالی ہندستان میں جاری ہوا ہے۔ مغل سلطنت قائم ہو جانے کے بعد یہ خط متروک ہو گیا اور مغل خط نستعلیق جاری ہو گیا حتیٰ کہ عمومی خط بن گیا۔ آج اردو اور فارسی نستعلیق خط میں لکھی جاتی ہیں۔

یوں تو ہر مسجد اور خانقاہ میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا تھا مگر علوم و فنون کی تدریس کے لیے جداگانہ مدارس بھی قائم کیے جاتے تھے۔ بعض مدارس نے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ مثلاً نظامیہ' بغدادیہ' مستنصریہ۔ لیکن ایران کا سب سے بڑا مدرسہ (campus) ربع رشیدی تھا جو تبریز میں تھا۔ اس کو ایل خانیوں کے وزیر رشید الدین فضل اللہ نے قائم کیا تھا۔ مدرسہ کیا تھا اہل علم کے لیے ایک جداگانہ بستی تھی۔ یہ سیکڑوں ایکڑ پر محیط تھی جس میں ہزاروں سقے پانی بھرتے رہتے تھے' لکڑہارے لکڑیاں ڈھوتے رہتے تھے اور دوسرے خدمت گار مختلف خدمات انجام دیتے رہتے تھے۔ یہاں علما' قرا اور حفاظ سیکڑوں کی تعداد میں رہتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس طرح کا ایک مدرسہ پرانی دہلی میں شہر کے باہر فیروز شاہ تغلق (۷۹۰ھ' ۱۳۸۸ء) نے بنایا تھا جس کے کھنڈرات آج بھی پرانی دہلی میں موجود ہیں۔

مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی نے اس کی کچھ تفصیل دی ہے: یہ مدرسہ ایک نہر کے کنارے تھا۔ مدرسہ ۷۰ ایکڑ پر محیط تھا۔ مدرسے کی عمارت دو منزلہ تھی۔ عمارت کے اوپر ایک گنبد تھا جس کے چاروں طرف رنگ برنگ شیشے لگے ہوئے تھے۔ ایک وسیع مسجد تھی۔ اساتذہ کی رہایش کے کمرے جداگانہ تھے۔ درس گاہ میں شیرازی قالین بچھے ہوئے تھے۔ مدرسے میں اساتذہ اور طلبہ کو مفت کھانا ملتا تھا۔ اساتذہ کو کھانے کے بعد چاندی کے اوراق میں لپٹے ہوئے پان کے بیڑے ملتے تھے۔ اساتذہ سر پر مصری دستار اور جسم پر شامی جبہ پہنے رہتے تھے۔ بادشاہ نے اس مدرسے کے لیے ایک بہت بڑا وقف قائم کر رکھا تھا۔

یہ علما ہر چیز سے بے نیاز ہو کر درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے انہماک اور مشغولیت کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ ۶۵۸ھ میں ہلاکو خان کے ہاتھوں بغداد کے سر سے ایک قیامت گزر گئی۔ ہر جگہ قتل و غارت گری اور آتش زنی کا بازار گرم تھا۔ ایک ہفتہ کے بعد جب تباہی کا یہ بازار ٹھنڈا پڑا تو ہلاکو خان اس اجڑے شہر کے گشت کے لیے نکلا۔ وہ مدرسہ مستنصریہ کی طرف جا نکلا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مدرسے میں حسب سابق درس و تدریس کی بساط جمی ہوئی ہے۔ علما بڑی یکسوئی سے طلبہ کو پڑھا رہے ہیں۔ جیسے کہ شہر میں کچھ ہوا ہی نہیں ہے (الفخری' طباطبائی)۔

اس سے ملتا جلتا انہماک کا واقعہ میاں جی نذیر حسین کا بیان کیا گیا ہے جو جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) میں پیش آیا۔ انگریزی فوجیں شہر پر گولہ باری کر رہی تھیں۔ گولے مسجد کے صحن میں آکر گر رہے تھے۔ اس مسجد میں میاں جی بڑی مستقل مزاجی سے حدیث کا درس دے رہے تھے۔ ساتھ ہی فرماتے جاتے تھے: "جس کی آئی ہے وہ مرے گا" (محمد اشرف سندھو)۔

درس و تدریس کے ساتھ یہ علما تصنیف و تالیف میں بھی وقت صرف کرتے تھے۔ بعض علما تو مستقل طور پر لکھنے کے لیے وقف رہے تھے۔ معجم البلدان کے مصنف یاقوت نے ابوریحان البیرونی (۱۰۵۱ء) کے متعلق لکھا ہے: البیرونی علم حاصل کرنے میں دن رات مشغول رہتا تھا۔ قلم کو ہاتھ سے اور آنکھ کو کتاب سے کبھی جدا نہیں کرتا تھا۔ سال میں دو دن ایسے تھے کہ وہ فارغ ہوتا تھا۔ وہ نوروز اور مہرجان کے دن تھے۔ یہ ایرانی تہوار تھے۔ ان دنوں میں اس کے دوست احباب ملنے کے لیے آتے تھے۔ وہ ان کے لیے کھانا پکا کر رکھتا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔

ہمارے یہاں بھی ایک ہمہ وقت تصنیف بزرگ مولانا وحید الدین حیدر آبادی تھے' صاحب وحید اللغات (۱۸۷۰ء)۔ وہ لکھتے ہیں: میری عمر اب ۷۰ کے قریب ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے آنکھ اور ہاتھ کی قوت مثل ایام جوانی کے ہے اور ابھی تک کئی میل پیدل چل لیتا ہوں۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ چھ بجے صبح سے شام پانچ بجے تک برابر لکھتا رہتا ہوں اور وہ بھی روزانہ۔ یہاں تک کہ یوم العید کو بھی ناغہ نہیں کرتا۔ بڑے بڑے قوی اور مضبوط جوان چھ گھنٹے کی کتابت کرنے کے بعد بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ میں ۱۱ گھنٹے برابر لکھتا رہتا ہوں۔ ذٰلِکَ فضل اللّٰہ یو تیہ من یشاء۔ باوجود اس کے کہ غذا میری دو پیسہ بھر چاول اور ایک پیسہ بھر آٹا اور سادہ شوربا اور کسی قدر دودھ آدھ پاؤ سے زیادہ نہیں۔

ایسے ہی کثیر التصانیف بزرگ نواب صدیق حسن خاں بھوپالی تھے۔ وہ دولت و امارت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ شادی' بیاہ میں امرا کے یہاں شرکت کرنے کے لیے ان کو جانا پڑتا تھا۔ وہاں دیر ہو جاتی تھی۔ نواب صاحب وقت کی قدر کرنے کے لیے ایک گوشے میں بیٹھ جاتے تھے۔ قلم دان ان کا ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا تھا۔ قلم دان کھول کر لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ ان کی تصنیف کردہ کتابوں کی تعداد کئی سو ہے۔ عربی' فارسی' اردو' تینوں زبانوں میں ان کی کتابیں ہیں۔

یہ علما انتہائی ناسازگار حالات میں تصنیف کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ مشہور عالم دین شمس الائمہ امام سرخسی سے وقت کا بادشاہ ایک فتویٰ کی بنا پر ناراض ہو گیا اور اس نے بطور سزا ان کو ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا اور قید کر دیا۔ امام کے علم کے فیض کا سرچشمہ وہاں سے بھی جاری ہو گیا۔ طلبہ اوزجند کے کنویں کی منڈیر پر جمع ہو جاتے تھے۔ امام سرخسی کنویں کے اندر سے املا کراتے تھے اور طلبہ اس کو لکھ لیتے تھے۔ اوزجند کا علاقہ سخت سرد ہے۔ طلبہ روشنائی کو پیٹ سے چمٹائے رکھتے تھے تاکہ روشنائی جمنے نہ پائے۔

فقہ حنفی میں بین الاقوامی قانون کی مشہور کتاب المبسوط اس حالت میں تصنیف ہوئی ہے۔

ہمارے ملک میں مفتی عنایت احمد کاکوروی بھی ایک ایسے ہی بزرگ ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے موقع پر انگریزی حکومت نے سخت انتقام لیا تھا۔ اہل علم کی کثیر تعداد کو کالے پانی کی سزا دی تھی یعنی' جزیرہ انڈمان میں محبوس کر دیا تھا۔ اس حالت میں ایک قیدی شخص نے مفتی عنایت احمد سے عربی زبان سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ مفتی صاحب نے پہلے حافظہ سے تدریس کے لیے ایک کتاب علم الصیغہ لکھی جو آج بھی عربی مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔

وہاں امیر احمد خاں ڈاکٹر تھے۔ انھوں نے مفتی صاحب سے سیرت الرسولؐ پر کتاب لکھنے کی فرمائش کی۔ اس کے پاس خاطر سے مفتی صاحب نے سیرت الرسولؐ پر تواریخ حبیب الہ کتاب لکھ دی۔ سیرت رسولؐ پر اردو کی یہ پہلی کتاب ہے۔ تواریخ حبیب الہ اس کا تاریخی نام ہے (۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۷ء)۔

بعض حکمران علم کے بڑے قدر دان ہوتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مشہور مصنف کی کتاب بادشاہ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نام معنون کر دی جائے۔ اس کی خاطر وہ بے دریغ رقم صرف کر دیتے تھے۔ ابو الفرج اصفہانی اموی عربی زبان و ادب کا بہت بڑا امام تھا۔ اس نے اس موضوع پر کتاب کتاب الاغانی لکھی تھی۔ قرطبہ (اندلس) کے خلیفہ الحکم ثانی (۳۶۶ھ) کو اس کا علم ہوا۔ اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ اس کتاب کا پہلا نسخہ میرے پاس ہونا چاہیے۔ اس کے لیے اس نے ایک ہزار دینار سرخ صرف کر ڈالے اور یہ نسخہ حاصل کر لیا۔

ہمارے ملک میں سلطان محمد شاہ تغلق (۷۵۳ھ) بڑا فاضل علم دوست حکمران تھا۔ اس کو معلوم ہوا کہ ایران میں مشہور عالم قاضی عضدالدین ایجی مواقف کی شرح لکھ رہے ہیں۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے مولانا عمرانی معین الدین دہلوی کو ایران بھیجا کہ مصنف کتاب میرے نام منسوب کریں اور خود دہلی میں آجائیں۔ تحفہ تحائف لے کر سلطان کی سفارت روانہ ہوئی۔ شیراز کے بادشاہ ابواسحاق کو ہندی سفارت کا علم ہوا تو اس نے قاضی عضدالدین کی منت سماجت کی کہ وہ یہاں سے ہرگز نہ جائیں۔ اس نے کہا کہ میں آپ کی ہر طرح خدمت کرنے کو تیار ہوں۔ میرا تخت حاضر ہے۔ میری منکوحہ کے علاوہ جو چاہیں لے سکتے ہیں۔ قاضی نے بادشاہ کی بات مان لی۔ ہندی سفارت ناکام واپس آگئی۔

علم و فن کی قدردانی کے ایک حیرت انگیز واقعے کا تعلق شاہ اسماعیل صفوی شاہ ایران کے ساتھ ہے۔ ترکوں اور ایرانیوں کے درمیان ایک بڑی فیصلہ کن جنگ ۹۲۰ھ میں چالداران کے نام سے لڑی گئی۔ دونوں طرف بڑی خون ریزی ہوئی۔ جب شکست کے آثار نظر آنے لگے تو شاہ اسماعیل صفوی نے حکم دیا کہ بہزاد نقاش اور محمود کاتب کو دارالسلطنت سے لے جا کر غاروں میں روپوش کر دو تاکہ جب عثمانی فوجیں شہر کو لوٹیں تو وہ ان دو نادر فن کاروں کو یہاں سے نہ لے جائیں۔

اس سے ملتا جلتا واقعہ ہمارے یہاں بھی پیش آیا۔ گجرات کی جنگ سے واپس آتے وقت بھیلوں نے ہمایوں کی فوج پر شب خوں مارا۔ لشکر میں موجود مال و متاع لوٹ کر لے گئے۔ اس میں تاریخ تیموری کا وہ نایاب نسخہ بھی تھا جس کو بہزاد نقاش نے مصور کیا تھا۔ ساری فوج نے وہیں ڈیرے ڈال دیے۔ ساری فوج اس نسخے کی تلاش پر مامور ہو گئی۔ بالآخر جب نسخہ حاصل ہو گیا تب آگے کوچ کا حکم دیا گیا (اکبرنامہ، ابوالفضل، جلد اول، ص ۱۳۶)۔

کتاب سازی اور نقش و نگار سازی کے طریقے مسلمان اپنے ساتھ لے کر ہندستان میں آئے۔ ہندوؤں کے زمانے میں تاڑ یا بھوج پتر پر کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ پھر ان پتوں کے درمیان سے دھاگا گزار کر ان کو نتھی کرتے تھے۔ وہ جلد بنانا نہیں جانتے تھے۔ جلد سازی عالم اسلام کی روایت ہے۔ مسلمانوں نے مختلف اقسام کے کاغذ بنانے سکھائے۔ سمرقندی، کشمیری، نیرن کوٹی (سندھی)، قلمی (روئی کا ساختہ)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمانوں نے جلد سازی کے فن کی تعلیم دی۔ جلد سازی نے ترقی کر کے ایک فن کی شکل اختیار کر لی۔ ایک جلد میں مختلف فن کار بیک وقت حصہ لیتے تھے' مثلاً کاغذ ساز' کاتب' مذہب' جدول کش' مجلد' صحاف' زرکوب' لاجورشو وغیرہ۔

برعظیم کے شہروں میں سب سے پہلے لاہور نے تہذیبی طور پر فروغ پایا ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۳ھ میں لاہور فتح کیا اور پھر اس کو دارالحکومت بنایا۔ اس کو غزنی خورد کہتے تھے۔ یہاں سلطان ابراہیم مسعود جیسا حکمران (۴۵۲-۴۵۰ھ) گزرا ہے جو سال میں دو قرآن مجید ہاتھ سے لکھ کر حرمین شریفین روانہ کرتا تھا۔ پھر باہر کے علما اور مشائخ یہاں آنا شروع ہو گئے۔ سید اسماعیل محدث (۴۲۸ھ)' سید حسین زنجانی (۴۲۱ھ)' ابو الحسن علی ہجویری (۴۶۵ھ) ان میں نمایاں نام ہیں۔ علم و فضل کے ساتھ شعروادب کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ ابوالفرج رونی (۴۹۲ھ) اور مسعود سعد سلمان لاہوری (۵۱۵ھ) اس دور کے مشہور شاعر تھے۔

لاہور کی یہ رونق زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی۔ تاتاریوں نے ۱۲۴۱ء (۶۳۹ھ) میں حملہ کر کے اسے بری طرح تباہ و برباد کر دیا۔ مغل حکومت کے دور میں لاہور نے دوبارہ عروج حاصل کیا۔ مغلوں نے لاہور میں باغات لگائے۔ لاہور کا گورنر مرزا قلیچ بیگ تھا۔ وہ مرزا دانیال کا خسر اور اکبر بادشاہ کا سمدھی تھا۔ وہ عالم دین تھا۔ اس کا معمول تھا کہ کچہری جانے سے قبل اڑھائی گھڑی دن تک طلبہ کو گھر پر باقاعدہ درس دیتا تھا۔ اس کے پاس ایک عالی شان کتب خانہ تھا۔

مغل حکمرانوں کے دور حکومت میں فن کتاب سازی اور فن خطاطی کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ مسجد وزیر خاں کے آس پاس کاتب' صحاف' وراق بیٹھے رہتے تھے۔ یہ لوگ بڑی عجلت میں کتابیں نقل کر دیتے تھے اور معمولی اجرت لیتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ بغداد کے سوق الوراقین کے مشابہہ تھا۔ اس مسجد میں علما' فضلا' شعرا' ادبا کا مجمع لگا رہتا تھا۔ خاص طور پر جمعہ کے روز یہاں بحث مباحثہ' نقد و تبصرہ ہوتا رہتا تھا۔ اس لحاظ سے یہ مسجد' قاہرہ مصر کی جامع عمرو بن العاص کے مشابہہ تھی اور جامع منصور بغداد کی روایات کو زندہ رکھے ہوئے تھی۔ سکھ حکومت کی آمد سے قبل تک مسجد وزیر خاں میں علمی روایات برقرار تھیں۔

بانی مسجد نے ضمیمہ وقف نامہ مسجد وزیر خاں لاہور میں ان روایات کی تاکید کی تھی:

اس مسجد کا امام اور خطیب ایک ہی ہو جو بڑا خوش قرات ہو' اور نماز کے احکام کا بڑا عالم ہو۔ نیز یہ شرط ہے کہ شرقی دروازہ کے باہر دو دکانیں مع بالاخانوں کے ہوں۔ یہ دکانیں اسلامی کتب کے صحافی' جلد ساز' جملہ کتابیں بیچنے والوں کے بیٹھنے کے لیے ہوں اور وہ بے کرایہ بیٹھیں گے۔ نیز شرط یہ ہے کہ مسجد میں دینی علوم کی تعلیم کے لیے دو مدرسے ہوں گے (ماخوذ از قانون وراثت' مصنف مولانا غلام دستگیر نامی' لاہوری' ص ۳۲)۔

© rasailojaraid.com